قرآن کا تصور نجات اور مسلمانوں میں رائج تصورات کا تحقیقی مطالعہ

جناب علی اصغر سلیمی
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ علوم اسلامیہ
بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

Abstract of the Article

Almost all considerable religions hold the concept of life after death. According to Islamic belief the most significant matter is the reason on which salvation depends. Although all the revealed religions basically have the same concept in this regard, but during the passage of time this original concept has been disfigured varily. During the revealation of Quran two basic misconceptions like negligence andsatisfaction befalled in the remaining followers of previous revealation (i.e.) Quraish, Jews and Cristians.

1.Negligence is that one should be overjoyed in ones life by disregarding the herafter.

2. Satisfaction is that one is satisfied by depending upon uneffecting supporters and takes the original suppoerter as unattainable Name, lineage nobility relation and oblations adopted as supporters for salvation. The same concept come in vogue in muslims also. But Quran warns against artificial supporters and guides to depend upon deeds for salvation Intercession should also be the medium of practise not the means of leisure about actions and deeds.

دنیا میں کوئی تصور حیات ایسا نہیں جس میں انسان کی اس دنیا کی زندگی کے بعد کے مراحل پر بحث نہ کی گئی ہو۔ اکثر مذاہب میں مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کا تصور پایا جاتا ہے اور وہ مرنے کے بعد کی زندگی کے اچھے یا برے نتیجے کو اس زندگی کے اعمال پر موقوف ٹھہراتے ہیں۔ الہامی مذاہب میں مرنے کے بعد کی زندگی کا تصور زیادہ واضح ہے۔ ان کے مطابق مرنے کے بعد کی زندگی ابدی ہے اور اس میں کامیابی یا ناکامی کا انحصار اس دنیا کے اعمال پر ہے جیسا کہ اقبال نے کہا:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے (۱)

آخرت میں نجات کے اعمال پر موقوف ہونے کا تصور ایسا سادہ، قابل فہم اور نتیجہ خیز تصور ہے کہ یہ ہر انسان کی فطرت کے اندر موجود ہے۔ یہ ہر غیر جانبدار شخص کے دل کی آواز ہے انسان بغیر کسی خارجی ذریعہ علم کے اگر خود غور کرے اور مرنے کے بعد کی زندگی میں کامیابی کے حصول کے ذرائع متعین کرنا چاہے تو وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ وہاں اس زندگی کی کارکردگی کے نتائج ہی ظاہر ہونے چاہئیں۔ آخرت میں نجات کا یہ تصور انسان کی زندگی پر بڑے گہرے اور مثبت اثرات مرتب کرتا ہے وہ اسے ایک ذمہ دار، فرض شناس اور جواب دہ ہستی بناتا ہے۔ ہر دور کے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے آخرت میں نجات کا یہی تصور پیش کیا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس سادہ سی حقیقت پر ذہن انسانی کی پراگندگیوں نے ایسے ایسے پردے ڈالے

اوران پردوں کو ایسے ایسے تقدس کے غلافوں میں لپیٹا کہ ان میں سے فطری سچائی کو نکھار کر لوگوں کے سامنے لانے کے لئے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو اپنی کوششوں کا ایک بڑا حصہ صرف کرنا پڑا۔

بعثت نبوی ﷺ کے وقت خطہ عرب اوراس کے گردوپیش میں گذشتہ انبیاء کرام علیہم السلام کے نام لیوا تین مذہبی گروہ پائے جاتے تھے۔ان میں ایک مکہ کے قریش تھے جو خانہ کعبہ کے متولی تھے وہ اپنی نسبت حضرت ابراہیمؑ کی طرف کرتے تھے اورانہی کی نسبت سے اپنے آپ کو دین حنیف کا پیروکار کہتے تھے۔ یہ گروہ نبی اکرم ﷺ کا مخاطب اول ٹھہرا۔ فتح مکہ کے بعداس گروہ کی مذہبی سیادت کا خاتمہ۔اس طرح ہوا کہ انکی بہت بڑی تعداد نے اسلام قبول کرلیا اور جو کچھ باقی بچے ان کے وجود سے بیت اللہ کو پاک کر دیا گیا۔ بالآخر پورے عرب میں اس مذہب کا ایک بھی پیروکار نہ رہا۔ دوسرا مذہبی گروہ یہود کا تھا۔عرب میں ان کی قابل ذکر تعداد مدینہ منورہ (جواس وقت یثرب کہلاتا تھا) اوراس کے گردوپیش میں آباد تھی۔اس گروہ کے کچھ لوگوں کو اسلام کی دولت نصیب ہوئی اور باقی منتشر ہو گئے۔ یہ گروہ آج بھی اپنی تعلیمات اور نام کے ساتھ خطہ ارضی پر نہ صرف موجود ہے بلکہ اسرائیل نامی ایک ملک کو اپنے مذہب کے نام میں وجود میں لاکر دنیا کے امن کو تہہ وبالا کرنے کا مرتکب بھی ہورہا ہے۔جبکہ تیسرا مذہبی گروہ عیسائیوں کا تھا جن کو قرآن مجید میں نصاریٰ کے نام سے پکارا گیا ہے۔اور جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام لیوا تھے۔عرب کے شمال میں شام اور یورپ میں عیسائیوں کی بہت بڑی حکومت قائم تھی جس کو قیصر روم کی حکومت کہا جاتا تھا اس حکومت کے اثرات دور دور تک پھیلے ہوئے تھے اور یہ حکومت اپنے عہد کی دو بڑی طاقتوں میں سے ایک شمار ہوتی تھی۔

ان تینوں مذہبی گروہوں میں جو باتیں مشترک تھیں ان میں سے ایک ان کے بگڑے ہوئے مذہبی رہنماؤں کا عوام پر تسلط تھا۔ عوام پر مذہبی رہنماؤں کے تسلط کی یوں تو بہت سی شکلیں تھیں مگر ہم ان میں سے دو کا ذکر کر کے عقیدہ آخرت کے بارے میں اسلامی تعلیمات کو ذرا تفصیل سے بیان کریں گے۔

ہر دور میں عام آدمی کے اہم ترین مسائل صرف دو ہی رہے ہیں۔ ایک مسئلے کا تعلق اس زندگی سے ہے جبکہ دوسرا مسئلہ مرنے کے بعد کی زندگی سے تعلق رکھتا ہے اس زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ زندگی کی نعمتوں، سہولیات اور برکتوں کا حصول اور اس کے غموں اور دکھوں سے نجات ہے۔ جبکہ مرنے کے بعد کی زندگی میں گناہوں کے نتائج سے حفاظت اور وہاں کے انعامات، آسائشات اور نعمتوں کا حصول ہے۔ ہر دور کے نبی اور ان کے سچے پیروکاروں نے انسان کے ان دو مسائل کا صحیح حل یہ پیش کیا کہ اس دنیا میں کامیابی کا راستہ اس کی اپنی محنت اور اس کی محنت کے پھل کی راہ کی رکاوٹوں کو دور کرنے کی جدوجہد میں مضمر ہے۔ جبکہ آخرت کی کامیابی کا ذریعہ اس دنیا میں اس کے اچھے اعمال اور خوشنودی رب کے لئے کیا ہوا اس کا ہر کام ہے اس طرح پوجا اور پرستش کے اعمال کے ساتھ ساتھ انسان کی نفع رسانی کے ہر کام کو بھی انہوں نے نیکی قرار دیا بلکہ ان کے ہاں حقوق العباد کی ادائیگی کو زیادہ اہمیت حاصل ہے مگر بگڑے ہوئے مذہبی رہنماؤں نے انسان کو زندگی کی حقیقی جدوجہد کے راستے سے ہٹایا اور پوجا پاٹ کو واحد راہ نجات قرار دے کر اسے اپنی ذات کے گرد جمع کرنے کی راہ پر لگایا۔ انہوں نے انسانوں کو یہ سمجھایا کہ ان کی اس زندگی کی کامرانیاں بھی انہی کی نظر کرم کی مرہون منت ہیں اور ان کی آخرت میں نجات بھی انہی کے طفیل ممکن ہے۔ مزید یہ کہ انسان اپنے عمل سے لاکھ کوشش کرے مگر جب تک ہماری تائید اسے

حاصل نہ ہوگی تب تک اس کے اعمال کا کوئی وزن نہ ہوگا۔ مذہبی رہنماؤں کی توجہ حاصل کرنے کا ذریعہ زیادہ تر ہر دور میں نذرانہ اور خدمت ہی رہا۔ یہ وہ گمراہی تھی جو بعثت نبویؐ کے وقت تینوں مذہبی گروہوں نے اپنے اپنے پیروکاروں کے ذہنوں میں پوری طرح بٹھائی ہوئی تھی۔ نبی اکرم ﷺ نے قرآن مجید کے ذریعے اس گمراہی کا علاج کیا۔ مکی دور کا بیشتر حصہ اصلاح عقائد پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک عقیدہ آخرت ہے اس کا اہم ترین سوال یہی ہے کہ آخرت میں نجات کا انحصار کس بات پر ہے۔ قرآن مجید نے اس بات کو واضح کرنے کے لئے اپنا پورا زور بیان صرف کیا ہے کہ آخرت میں نجات کا انحصار صرف اور صرف انسان کے اعمال پر ہے۔ سورۃ الاعراف میں ہے

﴿..... وَالوزن يومَئِذِ ن الحق فمن ثقلت موازينهٗ فاولئک هم المفلحون وَمن خفت موازينهٗ فاولئک الذين خسروا انفسهم بما كانو بَاٰيٰاتِنا يظلمون (۲)﴾۔

''اس دن وزن صرف حق کا ہوگا۔ پس جن کے پلڑے وزنی ہوں گے وہ فلاح پانے والے ٹھہریں گے اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہی ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں مبتلا کیا۔ کیونکہ وہ ہماری تعلیمات کا انکار کر کے اپنے اوپر ظلم ڈھاتے رہے''۔ قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ مرنے کے بعد ہر انسان انفرادی حیثیت میں اللہ کے سامنے پیش ہوگا اور اسے اسی حیثیت میں اپنی زندگی کا حساب دینا ہوگا۔

تفسیر طبری میں اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں لکھا ہے:

''ومعنى الكلام والوزن يوم نسائل الذين أُرسل اليهم

والمرسلين الحق حدثني المثنى. قال ثنا ابو حذيفه قال ثناء سُنبل عن ابى بخيع، عن مجاهد والوزن يومَئِذٍ القضاء وكان يقول معنى الحق هنا "العدل" ...... وقال الاخرون معنى قوله (والوزن يومئذ الحق) وزن الاعمال (۳)

سورۃ الانعام کی آیت نمبر ۹۴ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

﴿ولقد جئتمونا فردىٰ كما خلقنكم اوِل مرة......﴾ (۴)

''بے شک تم ہمارے سامنے اس طرح تن تنہا حاضر ہو گئے ہو جیسا کہ ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا''۔ انسان اس دنیا میں اکیلا آتا ہے اور اس حالت میں وہ نہایت بے بس اور دوسروں کی مدد کا مکمل طور پر محتاج ہوتا ہے۔ اگر اسے اس وقت خارج سے سہارا نہ ملے تو وہ اپنی زندگی کی ساعتوں کو بھی برقرار نہ رکھ سکے۔ مگر طاقت حاصل کرنے کے بعد وہ اپنی بے بسی کو بھول جاتا ہے۔ سہارے ملنے کے بعد وہ جواب دہی کو بھول جاتا ہے۔ نعمتیں پانے کے بعد شکر کو بھول جاتا ہے۔ اسے احساس نہیں رہتا کہ اس کا ہر ہر لمحہ ریکارڈ ہو رہا ہے اور اسے اس کا جواب دینا ہے۔ ارشاد خداوندی اسے اسی حقیقت کی یاد دہانی کرواتا ہے۔ فرمایا **﴿وان عليكم لحفظين كراماً كاتبين ......﴾** (۵) بے شک تم پر نگرانی کرنے والے مقرر ہیں۔ وہ بہت معزز ہیں تمہارے اعمال ان کے علم میں ہیں اور ان کو ضبط تحریر میں لا رہے ہیں۔ قرآن مجید انسان کو نجات کے لئے عمل کے سوا کسی ذریعے سے متعارف کراتا ہے اور نہ عمل کے سوا کسی اور راستے کی طرف لے کر جاتا ہے۔ لہٰذا عمل کی درست نگرانی کا ثبوت کراماً کاتبین سے پیش کرتا ہے۔ مولانا اصلاحی اس آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں:

ان فرشتوں کی صفت کرام سے مقصود اس حقیقت کی یاد دہانی ہے کہ جس ڈیوٹی پر یہ معمور ہیں۔ اس کو نہایت فرض شناسی پوری احساس ذمہ داری اور کامل غیر جانبداری کے ساتھ انجام دے رہے ہیں نہ کام چوروں کی طرح اپنے فرض سے کوئی غفلت برتتے، نہ احساس ذمہ داری سے محروم لوگوں کی طرح کبھی دفع الوقتی اور مداہنت سے کام لیتے اور نہ کسی کے دباؤ یا اس کی خوشامد میں آنے والے ہیں کہ کسی کے ساتھ غیر جانبداری برتیں۔ (٦)

قرآن مجید کی یہ وضاحت انسان کو اس کے اپنے عمل کے بارے میں اس مایوسی اور بے یقینی سے نکال دیتی ہے جو کم فہم لوگوں میں عام طور پر پیدا ہو جاتی ہے کہ انسان نیک عمل کرنے کے بعد بھی شک وشبہ ہی میں مبتلا رہتے ہیں کہ نہ معلوم ان کا عمل بارگاہ ایزدی میں مقبول ہوا ہے یا نہیں۔ قرآن مجید انسان کو یقین کی دولت سے مالا مال کرتا ہے وہ اسے بتاتا ہے کہ تمہارے اعمال کا ریکارڈ دو قسم کا ہوگا۔ اچھے اعمال کا ریکارڈ اور برے اعمال کا ریکارڈ، جو ریکارڈ زیادہ ہوگا انسان کے ساتھ سلوک بھی اسی قسم کا ہوگا۔ قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے:

﴿فاما من اوتی کتبه بیمینه فیقول هاؤم اقرء واکتبه، انی ظننت انی ملق حسابیة، .... واما من اوتی کتبه بشماله فیقول یٰلیتنی لم اوت کتبه o ولم ادر ما حسابیه o یٰلیتها کانت القاضیه o ما اغنٰی عنی مالیه هلک عنی سلطنیه﴾ (٧)

''پس جس کو اس کا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ کہے گا آؤ دیکھو اور پڑھو میرا اعمال نامہ۔ مجھے یقین تھا کہ مجھے حساب کتاب کے مرحلے سے گزرنا ہے۔ پس اسے تو ملے

گی من پسند زندگی۔ دوسرے گروہ کے بارے میں ارشاد فرمایا جس کو اس کے اعمال کا ریکارڈ بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کہے گا کاش مجھے میرا اعمالنامہ دیا ہی نہ جاتا اور نہ معلوم ہوتا مجھے میرا حساب کتاب۔ کاش میری موت ہی فیصلہ کن ہوتی۔ یعنی میں مر کر مٹی ہو جاتا اور حساب کتاب کے لئے دوبارہ نہ اٹھنا پڑتا۔ میرا وہ مال جو میں نے ناجائز طریقوں سے جمع کیا تھا وہ میرے کچھ کام نہ آیا اور میرا اقتدار و طاقت جس کی بنا پر مجھے کوئی خوف اور خطرہ نہ تھا اور ہر طرح کے ظلم اور زیادتیاں کرنے پر قادر اور حالات کو اپنے حق میں سازگار کرنے کا ماہر تھا وہ مجھ سے چھن گیا''۔

امام زمخشری نے اس آیت کی وضاحت کچھ اس انداز میں فرمائی ہے:

...... یعنی انه كان فی الدنیا مترفاً بطراً مستبشراً كعادة الفجار الذین لا یهمهم امر الاخره ولا یفكرون فی العواقب ولم یكن كئیبا حزینا متفكراً كعادة الصلحاء والمتقین وحكایة الله عنهم (انا كنا قبل فی اهلنا مشفقین) (وظن ان لن یحور) لن یرجع الی الله تعالیٰ تكذیباً بالمعاد لقال لا یحور ولا یحول. ای لا یرجع ولا یتضرَّ قال لبید. "یحور رماداً بعد اذ هو ساطع" (۸)۔

درج بالا عبارت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہل جنت سے بھی خطائیں سرزد ہوئی ہوں گی مگر ان کی اس دنیا میں نیکیوں کی کثرت اور خطاؤں کے اعتراف اور ان پر استغفار کر کے معاف کروا لینے کی وجہ سے ان سے درگزر ہوگا اور ان کا حساب آسان ہو جائے گا۔ مگر گناہ گاروں

کا نامہ اعمال ہی بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور اس کا سبب ان کی عقیدہ آخرت سے بے پرواہی ہوگی۔ اور دنیا کی زندگی میں اپنی خواہشات کی پیروی اور اللہ کی نافرمانی میں پڑے رہنے جیسے امور ہوں گے جب ان کے نامہ اعمال میں خیر اور نیکی کا پلڑا ہوگا تو انکا حساب بھی آسان نہ رہے گا بلکہ وہ اللہ کی سخت گرفت میں آجائیں گے۔

وقت نے دور حاضر میں امت مسلمہ میں عقیدہ آخرت سے متعلق اس اجلے صاف اور واضح تصور کو دھندلا کر دیا اس کی جگہ خودساختہ اور مناسب حال تصورات نے لے لی۔ عوام میں آخرت کے بارے میں گمراہی دو طرح کی پائی جاتی ہے۔

ا۔ غفلت۔

۲۔ اطمینان۔

غفلت یہ ہے کہ لوگ آخرت کی جواب دہی سے بے پرواہ ہو گئے ہیں۔ آخرت کے بارے میں اس غفلت کے اسباب بالائی طبقے اور نچلے طبقے میں مختلف ہیں۔ بالائی طبقہ اپنی دولت، اقتدار اور جاہ وحشمت سے بھرپور زندگی کے مزے اڑانے میں مست رہتا ہے۔ حقوق کی ادائیگی حساب کتاب اور جواب دہی کا تصور ہی اس کے لئے رنگ میں بھنگ ڈالنے کے مترادف ٹھہرتا ہے۔ لہٰذا آخرت میں جواب دہی کا کوئی کلمہ اگر اس کے کان میں پڑتا بھی ہے تو وہ اسے اپنے عیش ونشاط میں مخل سمجھ کر اس سے نگاہیں پھیرنے اور اسے اپنے ذہن سے نکال پھینکنے میں عافیت سمجھتا ہے۔ نچلے طبقے کی غفلت یہ ہے کہ وہ معاشرے میں قائم ظالمانہ اور استحصالی نظام کی چیرہ دستیوں، حق تلفیوں، ناانصافیوں، بے چارگیوں اور مصائب وآلام میں اس قدر گھرا ہوتا ہے کہ اسے آخرت کی زندگی کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ وہ زندگی کی تلخیوں سے

تنگ آ کر زندگی سے پیچھا چھڑانے کے لئے موت کی تمنا بھی کرتا ہے مگر اسے موت بھی اپنے وقت پر ہی آتی ہے۔ یہ تو بالائی اور نچلے طبقے کی آخرت کے بارے میں غفلت کا حال تھا۔

غفلت کی وضاحت کے بعد اب ذرا ایک نظر اطمینان کی حالت پر ڈالتے ہیں۔ آخرت کے بارے میں اطمینان عام طور پر درمیانے طبقے میں پایا جاتا ہے۔ درمیانہ طبقہ شعور حیات کی خوبی سے متمتع ہوتا ہے۔ دور زوال میں اس کا شعور حیات بھی ناقص ہو جاتا ہے۔ آخرت میں نجات کے لئے یہ اپنے عمل پر انحصار نہیں کرتا کیونکہ اس کے نزدیک نیکی کا تصور اس قدر ارفع اور بلند ہوتا ہے کہ وہ محض اس کی تمنا کر سکتا ہے۔ مگر اس کو پا نہیں سکتا۔

حالانکہ قرآن کا تصور اس کے بارے میں بالکل واضح ہے۔ سورۃ البلد میں آتا ہے:

﴿یایتھا النفس المطمئنة ارجعی الٰی ربک راضیة مرضیه فادخلی فی عبدی وادخلی جنتی﴾ (۹)

اے نفس مطمئنہ اپنے رب کی طرف چل تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

تفسیر طبری میں نفس مطمئنہ کی وضاحت کچھ یوں آتی ہے:

یقول اللہ تعالیٰ ذکرہ مخبراً عن قیل الملائکة لِاَولیائِہٖ یوم القیامه یایتھا النفس المطمئنة یعنی بالمطمئنة التی اطمانت الٰی وعد اللہ الذی وعد اھل الایمان له فی الدنیا من الکرامة فی الاخرہ. فصدقت بذلک. حدثنا ابن

عبدالاعلیٰ قال: ثنا ابوثور عن معمر عن قتادہ والحسن فی قولہ (یایتھا النفس المطمئنة) المطمئنة الی ما قال اللہ والمصدقة بما قال اللہ ..... حدثنا ابن بشار قال ثنا عبد الرحمن قال ثنا سفیان عن منصور عن مجاھد (یایتھا .....) ایقنت بان اللہ وبھا وضربت لامرہ جاشا" (۱۰)

تفسیر بیضاوی میں لکھا ہے:

علٰی اِرادة القول وھی التی اطمانت بذکر اللہ فان النفس ترقیٰ فی سلسلة الاسباب والمسببات الی الواجب لذاتہٖ فتستقر دون معرفتہٖ و تستغنی بہ عن عبرہٖ او الی الحق بحیث لا یریھا شک اَوِالأمنة التی لا یستفزھا خوفٌ ولا حزنٌ. وقد قرئ لھا (ارجعی الٰی ربک) الٰی امرہٖ او مد عدہٖ بالموت ویشعر ذلک لقولہ تعالیٰ(فادخلی فی عبادی) فی جملہ عبادی الصالحین (وادخلی جنتی) معھم او فی زمرة المقربین (۱۱)۔

تفسیر کشاف میں نفس مطمئنہ کو اس طرح واضح کیا گیا ہے:

علیٰ ارادة القول ای یقول اللہ للمؤمن (یایتھا) اما ان یکلمہ اکراماً لہ کما کلم موسیٰ صلوٰت اللہ علیہ او علیٰ

لسان ملک (والمطمئنة) الامنة التی لا یستفزها خوف ولا حزن وهی النفس المؤمنة او المطمئنة الی الحق التی سکنها ثلج الیقین فلا یخالجها بشک (۱۲)۔

درج بالا تفاسیر سے نفس مطمئنہ کا تصور واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔ امام طبری نفس مطمئنہ اس کو کہتے ہیں جس کو اللہ کی بات پر یقین ہو اور جس نے اس کی تصدیق کی ہو اور جو یقین سے اللہ کے حکم پر چلے۔ اسی طرح قاضی بیضاوی اطمینان کی کیفیات کو واضح کرتے ہیں۔ معرفت کے حصر کے ساتھ شک اور خوف کی نفی کو اطمینان کہتے ہیں۔ اسی طرح امام زمخشری یقین کو شک سے خلط ملط نہ کرنے والے کو نفس مطمئنہ کہتے ہیں۔ اسی طرح دیگر تفاسیر سے بھی یہی بات سامنے آتی ہے اور اس سب کچھ سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کے نتیجہ میں انسان کو اطمینان حاصل ہونا چاہئے کہ اس نے اللہ کی اطاعت کی تو اللہ اس اطاعت پر راضی ہوگا۔ ایک حدیث مبارکہ سے بھی اطمینان کی انہیں کیفیات کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت ابی امامہ سے روایت ہے:

وعن ابی امامه ان رجلاً قال رسول الله ﷺ ما الایمان اذا سِرتَکَ حَسَنَتَکَ و ساء ئک سیئک فانت مومن قال یا رسول الله فما الاثمُ قال اذا حاک فی نفسک شیٌ فدعهُ (۱۳)۔

ابی امامہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ سے پوچھا ایمان کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جب تیری نیکی تجھ کو اچھی معلوم ہو اور تیری بدی تجھ کو بری محسوس ہو تب تو مومن ہے۔

پھر اس نے پوچھا یا رسول اللہ گناہ کیا چیز ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جب کوئی چیز تیرے دل میں تردد پیدا کرے اور مشتبہ معلوم ہو اس کو چھوڑ دے۔ حضور ﷺ نے ایمان کا نتیجہ نیکی پر اطمینان قرار دیا مگر دورِ زوال میں ایمان اور نیکی پر اطمینان کا یہ تصور گم ہو گیا اور اس کی جگہ عمل کی بے توقیری کا تصور رائج ہو گیا کہ انسان عمل کر کے بھی نہ کرنے کی طرح ڈرتا رہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نیکی کے اس ارفع تصور تک نہ پہنچ سکنے کی مجبوری انسان کو ایسے تصورِ نجات کو تسلیم کرنے پر آمادہ کر دیتی ہے جو نجات کی آسان تدابیر پر مبنی ہوتا ہے۔ معاشرے کے طلب و رسد کے مطابق جہاں طلب پیدا ہوتی ہے وہیں رسد کا سامان بھی مہیا ہو جاتا ہے۔ معاشرے میں حقیقی نیکی تک رسائی کے ناممکن ہو جانے کے بعد نجات کی آسان راہ کی طلب شدت سے پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر اللہ کی بات پر دھیان دیا جاتا تو نیکی کا حصول ایسا ناممکن نہ رہتا کہ عام آدمی کی اس تک رسائی ہی نہ ہو سکتی۔ کیونکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے صاف اعلان فرمایا ہے کہ ﴿لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا﴾ (۱۴) ''اللہ نے کسی جان پر ایسا بوجھ ڈالا ہی نہیں جس کو وہ اٹھا نہ سکے۔

مولانا اصلاحی لکھتے ہیں یہ دعا کے بیچ میں ایک جملہ معترضہ ہے اور اس کے لانے سے اس اہم حقیقت کا اظہار ہے کہ سمع و طاعت کی جو ذمہ داری اس امت پر ڈالی گئی ہے وہ بھاری ذمہ داری ہے۔ مگر اس میں ہر شخص تا بہ حدِ استطاعت مکلّف ہے۔ شریعت نے اس امر کو احکام میں ملحوظ رکھتے ہوئے رخصتیں دی ہیں نہ تو اللہ کو بندوں کو تکلیف مالا یطاق میں ڈالنا پسند ہے نہ یہ جائز ہے کہ کوئی دوسرا ان کو کسی ایسے بوجھ میں ڈالے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ حضور ﷺ بھی سمع و طاعت کا عہد لیتے وقت تا بہ حد استطاعت کی شرط لگوا دیتے۔ (۱۵)

لہذا یہ دور بگاڑ کے مذہبی پیشوا ہوتے ہیں جو انسانوں پر ایسے ایسے بوجھ لا دیتے ہیں

جن کے نیچے وہ دب جاتے ہیں اور نجات کے آسان راستوں کی تلاش ان کی مجبوری بن جاتی ہے۔

نیکی کے ارفع تصور کو اختیار نہ کر سکنے کی مجبوری کے پیش نظر بگاڑ کے دور میں لوگ نجات کے جن ذرائع پر مطمئن ہو جاتے ہیں ان کو نام، نسب و نسبت اور نذرانہ کی اصطلاحات کی صورت میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

1۔نام:

عام لوگوں میں یہ تصور رائج ہو جاتا ہے کہ تم اپنے عمل کی بنا پر جنت حاصل نہیں کر سکتے البتہ اپنے مذہب پر پکے رہنے کی وجہ سے بالآخر تمہارا جنت میں داخلہ یقینی ہے لہٰذا بس تم اس نام کے ساتھ وابستگی کو سختی سے قائم رکھو یہ تصور لوگوں کے اندر احساس ذمہ داری پیدا کرنے کی بجائے مذہبی شدت پسندی کو جنم دیتا ہے۔ قرآن مجید نے محض نام کی بنا پر حصول جنت کے اس تصور کی نفی کر کے نجات اخروی کے حقیقی اسباب کو کھول کر بیان کیا ہے۔ سورۃ بقرہ میں ارشاد فرمایا:

﴿وقالوا لن یدخل الجنة الا من کان هوداً او نصاریٰ تلک امانیهم قل هاتوا برهانکم ان کنتم صٰدقین o بلی من اسلم وجههٗ وهو محسنٌ فله اجره عند ربه ولا خوف علیهم ولا هم یحزنون﴾ (۱۶)۔

انہوں نے کہا کہ کوئی بھی شخص جنت میں ہرگز داخل نہیں ہو سکے گا جب تک وہ یہودی

اور عیسائی نہ ہوگا یعنی جنت میں داخلے کے لئے یہودی یا عیسائی نام کے ساتھ وابستگی ضروری ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ ان کی خواہشات ہیں اس دعویٰ یا عقیدے کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ ایسا عقیدہ رکھنے والوں سے کہو کہ اپنے اس دعویٰ کی سچائی پر دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو پھر اللہ تعالیٰ نے آخرت میں نجات کے حقیقی اسباب کو بیان کر کے پوری انسانیت کے سامنے حق کو روشن کر دیا فرمایا: ہاں جو اپنی خود مختاری سے دستبردار ہو کر کلی طور پر اللہ کا مطیع فرمان ہو گیا اور اس نے اپنے عمل کے اندر کامل درجے کا حسن پیدا کرنے کی کوشش کی پس اس کا اجر اس کے رب کے پاس محفوظ ہوگا اسے کسی خوف کا اندیشہ ہوگا اور نہ وہ کسی غم میں مبتلا ہوگا ان دو آیات کے مضمون نے آخرت میں نجات کیلئے محض نام سے وابستگی کی نفی کر کے ایمان اور عمل میں حسن پیدا کرنے کو معیارِ نجات ٹھہرایا ہے یہ معیار عقل کے بھی عین مطابق ہے اور فطرت انسانی بھی اسی تصور کی تائید کرتی نظر آتی ہے۔

۲۔ نسب:

نسب کو بھی نجات کا ذریعہ قرار دے کر مختلف مذاہب نے اپنے پیروکاروں کو خوش اور مطمئن کرنے کا سامان کیا۔ نسب پر نجات کے انحصار کا تصور لوگوں کے اندر عجب، تکبر، نخوت اور غرور جیسی صفات بد پیدا کر دیتا ہے اس تصور کے نتیجے میں لوگ عمل سے تہی ہو جاتے ہیں بلکہ انکے ہاں عمل بے توقیر ٹھہرتا ہے اور نسب باوزن بن جاتا ہے چنانچہ آخرت میں کامیابی کا یہ غلط تصور اس دنیا کے معیارِ فضیلت پر بھی اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہتا چنانچہ اس تصور کے زیرِ اثر معاشروں کے اندر کارکردگی کے ذریعے مقام بلند پانے کی بجائے نسب بدل کر عزت پانے کا

رواج عام ہو جاتا ہے قرآن مجید نے اس خرابی کی بھی نشاندہی کی اور اس کی اصلاح کرنے پر زور دیا فرمایا کہ:

﴿وقالت اليهود و النصارىٰ نحن ابناء الله واحباءُ ه قل فلم يعذبكم بذنوبكم بل انتم بشر ممن خلق يغفر لمن يشاء ويعذب من يشاء ولله ملك السموت والارض وما بينهما واليه المصير﴾ (۱۷)

''یہود و نصاریٰ نے کہا کہ ہم اللہ کے پیارے اور چہیتے ہیں آپ ان سے پوچھئے کہ اگر ایسا ہے تو پھر اللہ تمہارے کرتوتوں پر تمہیں سزا کیوں دیتا ہے تم عالی نسب نہیں ہو بلکہ عام انسانوں کی طرح انسان ہو جنہیں اللہ نے پیدا فرمایا ہے لوگوں کی بخشش کا انحصار نسب پر نہیں بلکہ خالصتاً اللہ کی چاہت پر موقوف ہے جو اللہ کے نزدیک بخشش کا مستحق ہوگا اسے اللہ بخش دے گا اور جو اس کے نزدیک گرفت اور پکڑ کا مستحق ہوگا اسے سزا دے گا آسمان اور زمین کی بادشاہت اور جو کچھ اس کے درمیان میں ہے سب کا مالک اللہ ہے، تمام انسانوں کو لوٹ کر اسی کی طرف جانا ہے اور سب کو اسی کے سامنے حاضر ہو کر اپنی زندگی کا حساب دینا ہے اس آیت میں نسب پر انحصار کی نفی کر کے عمل پر انحصار کی تعلیم دی گئی ہے۔ تقریباً تمام مفسرین نے اس آیت کی وضاحت میں بنی اسرائیل کی تاریخ سے دلائل دیئے مثلاً امام زمخشری لکھتے ہیں:

(ابناء الله) اشاع ابن الله عزيز والمسيح كما قيل الاشباع ابى خبيب وهو عبدالله بن زبير و الخبيبون وكما كان يقول رهط

مسیلمہ نحن ابنیاء اللہ و یقول اقرباء الملک وزردہ وحشمہ: نحن الملوک ولذٰلک قال مومن ال فرعون لکم الملک الیوم (فلم یعذبکم بذنوبکم) فان صح انکم ابناء اللہ و احباء ہ فلم تعذبون بذنوبکم فتمسخون و تمسکم النار ایام معدودات علی زعمکم ولو کنتم ابناء اللہ لکم من جنس الاب، غیر فاعلین للضائح ولا مستوجبین للعقاب من خلق من البشر (یغفرلمن یشاء) وھم اھل الطاعۃ (ویعذب من یشاء) وھم العصاۃ (۱۸)۔

اسی طرح مولانا اصلاحی لکھتے ہیں:

''جب تم نے خدا سے سرکشی کی اس نے ایسی عبرت انگیز سزائیں دیں کہ دنیا کی کسی قوم کی تاریخ میں ایسی سزاؤں کی مثال نہیں مل سکتی..... یہ سب واقعات تورات میں درج ہیں۔ اگر ابراہیم واسحٰق کی اولاد ہونے کی وجوہ سے تمہیں کوئی براءت نامہ حاصل ہے تو اس نے تمہیں دنیا میں کیوں عذابوں سے نہ بچایا۔ (تو آخرت میں بچاؤ کیسے ممکن ہے) (۱۹)

درج بالا حوالہ جات نامہ ونسب کے نجات پر اثر انداز ہونے کی تصور کی دلائل کے ساتھ نفی کرتے ہیں۔

۳۔نسبت:

نسبت پر نجات کا انحصار بھی لوگوں کے اندر خوش فہمی اور خوش عقیدگی کو جنم دینے کا باعث بنتا ہے وہ اپنی نسبت پر فخر کرتے اور اسی کو آخرت میں نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں نسبت پر انحصار کا تصور لوگوں کے اندر عمل کی بجائے ذریعے اور وسیلے کی قدر و قیمت کو عام کر دیتا ہے لوگ عمل کی مشقت میں پڑنے کی بجائے ایسے ذریعے کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں جو ان کی نجات اخروی کا ذمہ لے لے، چنانچہ ایسے معاشروں کے اندر نسبتوں کی تلاش، اپنی اپنی نسبتوں پر فخر اور ان کے ساتھ تعلق مبالغے کی حد تک پہنچ جاتا ہے اس تصور کو بھی قرآن مجید نے رد کیا ہے اور نجات کے لئے عمل کو واحد ذریعے کے طور پر پیش کیا ہے۔ سورۃ البقرہ میں ارشاد ہے: ﴿ومن الناس من یتخذ من دون اللہ اندادا یحبونھم کحب اللہ والذین امنوا اشد حبا للہ ولو یری الذین ظلموا اذ یرون العذاب ان القوۃ للہ جمیعا وان اللہ شدید العذاب اذ تبرا الذین اتبعوا من الذین اتبعوا وراوا العذاب وتقطعت بھم الاسباب وقال الذین اتبعوا لو ان لنا کرۃ فنتبرا منھم کما تبروا منا کذلک یریھم اللہ اعمالھم حسرات علیھم وماھم بخارجین من النار﴾ (۲۰)۔

ترجمہ اور ترجمانی پیش خدمت ہے۔

لوگوں میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اللہ کے سوا دوسری غیبی طاقتوں اور مقدس ہستیوں کے ساتھ وابستگی کو نجات کا ذریعہ قرار دیتا ہے وہ ان سے محبت کرتے ہیں جیسی اللہ سے محبت ہوتی ہے مگر جو مومن ہیں وہ صرف اللہ ہی سے شدید محبت کرتے ہیں اگر تو دیکھے ان لوگوں کو جنہوں نے اللہ کے علاوہ سہارے بنا کر اپنے اوپر ظلم کیا جب وہ اپنے اعمال کی سزا کو دیکھیں گے

اور یہ دیکھیں گے کہ اس سزا سے بچانے کے لئے جن پر ہم نے انحصار کیا تھا وہ تو موجود نہیں یہاں تو قوت ساری کی ساری اللہ کی ہے اور یقیناً اللہ کی سزا بڑی سخت ہے یاد کرو اس وقت کو جب جن کی اتباع کی جاتی تھی وہ ان لوگوں سے جو اتباع کیا کرتے تھے اعلان برأت کر دیں گے اور خوش فہمیوں میں پڑنے والے اپنے اعمال کی سزا کو دیکھ لیں گے اور انکے وہ تمام سہارے ٹوٹ جائیں گے جن کے بل بوتے پر انہوں نے آخرت میں اپنی نجات کو یقینی سمجھ لیا تھا تب اتباع کرنے والے کہیں گے کہ کاش ہمیں دنیا میں جانے کا ایک موقع اور ملے اور ہم بھی ان سے اسی طرح اعلان برأت کر کے (خالص اللہ کی خوشنودی کیلئے اعمال بجالائیں) جس طرح انہوں نے ہم سے اعلان برأت کر دیا ہے اس طرح اللہ انکے بزعم خود اچھے اعمال کو ان کے لئے باعث حسرت و یاس بنا دے گا کیونکہ انہوں نے یہ اعمال اللہ کو راضی کرنے کی بجائے ان ہستیوں کی خوشنودی کی خاطر کئے تھے، جن کے ساتھ نسبت رکھنا ان کے خیال میں ان کی آخرت کی نجات کا باعث تھا وہ تو دنیا میں اس بات پر مطمئن تھے کہ ان کی نسبتیں ان کی نجات کا یقینی ذریعہ ہیں مگر وہ جہنم میں ایسے گریں گے کہ وہاں سے نکلنے کا نام تک نہ لیں گے۔

۴۔ نذرانہ:

دور بگاڑ میں نذرانے کو بھی نجات کا ایک اہم ذریعہ سمجھا جاتا ہے یہ تصور دراصل آخرت میں فیصلوں کے معیار کو دنیاوی فیصلوں کے مطابق سمجھنے کی غلط فہمی سے جنم لیتا ہے بدعنوان معاشروں میں کام بنانے میں مال و دولت کو بہت دخل حاصل ہو جاتا ہے وہ معاشرے دام بنائے کام جیسے محاوروں کا عملی منظر پیش کرتے ہیں ایسے معاشروں میں لوگوں کے ذہن کا سانچہ کچھ اس

قسم کا بن جاتا ہے کہ وہ انصاف کو بھی بکاؤ مال سمجھنے لگ جاتے ہیں ان کے خیال میں ہر نعمت اور ہر کامیابی مال کے بدلے میں حاصل کی جا سکتی ہے ان کے ان تصورات کو معاشرے کی عملی صورتحال پختہ تر کرتی چلی جاتی ہے، چنانچہ وہ آخرت کو بھی دنیا پر قیاس کر کے یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ آخرت میں بھی نجات نذرانے کے ذریعے حاصل کی جا سکتی ہے آخرت میں نذرانے کے ذریعے نجات حاصل کرنے کا تصور جہاں ایک طرف بدعنوان معاشرے کی پیداوار ہوتا ہے وہیں دوسری طرف یہ بدعنوانی کو جنم دینے اور اسے عام کرنے کا بھی باعث بنتا ہے اس تصور کے مطابق جس کے پاس دولت ہے وہ ہر چیز کو اپنے حق میں استعمال کرنے کی قدرت رکھتا ہے حتیٰ کہ وہ مال کے ذریعے اللہ کے فیصلوں پر بھی اثر انداز ہو سکتا ہے یہ تصور انصاف کا خون کر دیتا ہے اور یہ مالداروں کے لئے نہایت پرکشش جبکہ بے نواؤں کے لئے باعث صد محرومی ہے مال کے بدلے نجات پانے پر یقین رکھنے والوں کی خوش فہمی کو اللہ تعالیٰ نے دوٹوک انداز میں رد کر دیا ہے ساتھ ہی سفارش پر انحصار کرنے والوں کی بھی اصلاح کر دی ہے کہ وہ اس قسم کی کسی خوش فہمی میں پڑ کر اپنی آخرت سے غافل نہ رہیں بلکہ نجات کے حقیقی ذریعے یعنی عمل کی راہ کو اختیار کریں سورۃ الانعام میں آتا ہے:

﴿وذر الذين اتخذو دينهم لعباً ولهواً وغرتهم الحياة الدنيا وذكر به ان تبسل نفس بما كسبت ليس لها من دون الله ولى ولاشفيع وان تعدل كل عدل لايؤخذ منها اولئك الذين ابسلوا بما كسبوا لهم شراب من حميم وعذاب اليم بما كانوا يكفرون﴾ (۲۱)

''چھوڑ دو ان لوگوں کو جنہوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا ہے انہیں دنیا کی زندگی (کی آسائشات وفراوانیوں) نے فریب اور دھوکے میں مبتلا کر رکھا ہے آپ قرآن کے ذریعے نصیحت اور تنبیہ کرتے رہو کہ کہیں کوئی شخص اپنے کرتوتوں کے وبال میں گرفتار نہ ہو جائے گرفتار بھی اس دن ہو جس دن اللہ سے بچانے والا کوئی حامی اور کوئی سفارشی اس کے لئے نہ ہو اور اگر ہر ممکن چیز فدیہ میں دے کر چھوٹنا چاہے تو وہ بھی اس سے قبول نہ کی جائے کیونکہ ایسے لوگ تو خود اپنی کمائی میں پکڑے جائیں گے ان کو اپنے انکار حق کے بدلے میں کھولتا ہوا پانی پینے کو اور دردناک عذاب بھگتنے کو ملے گا''۔

اس آیت مبارکہ میں نذرانے کے ساتھ ساتھ سفارش کی بھی نفی کر دی گئی ہے اگرچہ نسبت پر انحصار کی نفی دراصل سفارش ہی کی نفی ہے تاہم سفارش کے بارے میں چند مزید باتیں پیش خدمت ہیں آخرت میں نجات کے لئے ایسی کسی سفارش کا کوئی امکان نہیں ہے جو حق کو باطل اور باطل کو حق کر دے کیونکہ اللہ کا فیصلہ علم پر مبنی ہوگا اور وہ اکیلا اپنی قوت سے نافذ کرنے پر قادر ہو گا اللہ کیلئے کسی ایسی مجبوری کا تصور بھی اس کی شان میں نہایت بے ادبی ہے کہ جس کی بناء پر وہ اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور ہو جائے خواہ محبت کی بناء پر یا ڈر یا خوف کی بناء پر پس اللہ کے ہاں صرف ایسی سفارش کے منظور ہونے کا امکان باقی رہ جاتا ہے جو خود اس کی اجازت سے ہو چنانچہ کھلم کھلا نافرمانیوں کے ارتکاب کے بعد اگر کوئی اس خوش فہمی میں رہنا چاہے کہ کسی کی سفارش اسے گرفت سے بچا کر فلاح سے ہمکنار کر دے گی تو بڑے شوق سے رہے لیکن یاد رکھے کہ اللہ کے قرآن میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے اللہ نے شفاعت کو بھی اپنی اجازت کے ساتھ مشروط کیا ہے اور ایک جگہ یہ بات بھی واضح کی ہے کہ سفارش کرنے والا صحیح سفارش کرے گا آج مسلمانوں میں بھی نبی

اکرم ﷺ کی شفاعت کا جو تصور پایا جاتا ہے اس کی بناء پر ہمیں نافرمانی پر جری نہیں ہو جانا چاہئے بلکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی پورے خلوص کے ساتھ اطاعت بجا لاتے ہوئے شفاعت نبوی ﷺ کی امید رکھنی چاہئے۔

حوالہ جات

۱۔ راغب اصفہانی، امام، مفردات القرآن، ص ۲۱، اہلحدیث اکادمی لاہور

۲۔ القرآن، ۲۹:۶۴

۳۔ اقبال، بانگ درا

۴۔ القرآن، ۷:۸، ۹

۵۔ طبری، محمد ابن جریز، امام، جامع البیانعن تاویل القرآن، جز ۸، ص ۱۲۲ تا ۱۲۴، دارالفکر، بیروت

۶۔ القرآن، ۶:۹۳

۷۔ القرآن، ۸۲:۱۰، ۱۱

۸۔ اصلاحی، امین احسن، مولانا، تدبر قرآن، ج ۹، ص ۲۴۴، فاران فاؤنڈیشن لاہور

۹۔ القرآن، ۶۹، ۱۹ تا ۲۸

۱۰۔ الزمخشری، محمود بن عمر، الکشاف عن حقائق غوامض القرآن، الجزاالرابع، ص ۷۲۷

۱۱۔ القرآن، ۸۹:۲۷ تا ۳۰

۱۲۔ الطبری، امام، البیان عن تاویل القرآن، الجز ثلاثون، ج ۱۵، ص ۱۹۰، دارالفکر

۱۳۔ البصاوی، ناصرالدین، عبداللہ بن عمر، انوار التنزیل واسرار التاویل، الجز الثانی، ص ۵۵۹، مکتبہ شرکت و مصطفیٰ الہامی

۱۴۔ الزمخشری، الکشاف، الحزاالرابع، ص ۷۰۲

۱۵۔ مشکوۃ المصابیح، ولی الدین محمد بن عبداللہ خطیب عمری، مترجم: ج۱، ص ۱۶، کتاب الایمان، قرآن محل کراچی

۱۶۔ القرآن، ۲:۲۸۶

۱۷۔ اصلاحی، امین احسن مولانا، تدبر قرآن، ج۱، ص ۶۵۰، فاران فاؤنڈیشن

۱۸۔ القرآن، ۲:۱۱۱، ۱۱۲

۱۹۔ القرآن، ۴، ۱۸

۲۰۔ الزمخشری، الکشاف، الجزء الاول، ص ۶۱۸

۲۱۔ اصلاحی، تدبر قرآن، ج ۲، ص ۴۸۳

۲۲۔ القرآن، ۲، ۱۶۵ تا ۱۶۷

۲۳۔ القرآن، ۶:۷۰